

انگلیوں پر کئی کئی بار گن کر سوئی تھیں۔ ویسے تو وہ اب حساب میں اتنی تیز ہو چکی تھیں کہ کھڑے کھڑے کئی سو جوڑوں کا حساب لگا کر کئی گاہک بھگتا کر اگلوں کا انتظار کرنے لگتیں، پر انہیں یہ حساب کتاب کرنے کروانے میں مزاحمت آتا تھا۔ اس حساب کا حاصل جمع انہیں بڑی مسرت دیتا تھا۔ اس حاصل جمع سے وہ شاہ عالمی، انارکلی بازار جا کر کئی سو مسرتیں خریدتی تھیں۔ تو اتنا مسرت آمیز کام کوئی بار بار کیوں نہ کرے۔  
جمیل اتنی بار لکھ لکھ کر تھک چکا تھا۔ ”اماں بس بھی کرو۔ روز لکھوانے بیٹھ جاتی ہو۔ کب آئے گی تھانے پارنی۔“  
”ججے وہ لفظ لکھتے موت پڑتی ہے۔ اسے دیکھ اپنے

”وشر بے مثال ہے۔“ اندرون لاہور۔ موچی دروازہ۔ محلہ سیدال۔ نیلی گلی۔ اندھیر گلی۔ ذرا سا بادل چھا جائیں تو ایسا لگے کہ زمین پر کبھی روشنی کی کرنیں اترتی ہی نہیں۔  
ہمار کبھی برسی ہی نہیں۔ پھول، پودے، درخت۔ رنگ، خوشبو کبھی مٹنے ہی نہیں۔  
اسی نیلی گلی کے سارے گھر کی گھاس میں بادل تو کبھی برسنا ہی نہیں۔ دھوپ تو کبھی چمکی ہی نہیں۔ جاڑا ٹھنڈا گیا۔ نرم گرم تو کبھی ہوا ہی نہیں۔ نیلی گلی کا یہ پہلا کنارے والا گھر میدے کا ہے۔ میدے کی بیوی کا ہے۔ دونوں میاں بیوی کے گیارہ بچوں کا ہے۔

## سمیگ حمید



بھائی کو، وہ سی سی کر نہیں تھکتا۔ اماں نے حسب عادت پیشانی سے بالوں کا کچھا پکڑ کر مروڑا۔  
جمیل نے سر جھٹکا۔ ”انسان ہیں ہم۔ جن دن نہیں۔“  
”ایک وقت میں پانچ پانچ کچے کھا جاتا ہے تب بھی تو انسان ہی ہوتا ہے نا۔“  
”وہ پدے پدے سے کچے۔ تیرا ڈرنہ ہو اماں تو دس کھا جاؤں۔“  
”مجھے تو تجھ سے ڈر لگتا ہے کہ ہمیں ہی نہ کھا جائے۔ چل لکھ۔“  
”لکھ تو لیا سب۔“

اور۔ اور۔ جمال۔ ہاں جمالے کا بھی تو۔ اسے بھی یہیں کہیں ادھر ادھر ہونا تو چاہیے، اسی گھر میں، زندوں میں گیارہ بچوں میں ہی، یہیں کہیں ہی ہاں، ہاں وہ اسی گھر میں ہے۔ زندوں میں ہی ہے۔ اور۔ اور۔ خیر۔ خیر۔

ہاں تو میدے کی بیوی گیارہ بچوں کی اماں پانچویں میں پڑھنے والے سب سے چھوٹے بیٹل کو پاس بٹھائے کوئی گیارہویں بار بول بول کر حساب لکھوا رہی ہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں رہنے والی تھانے پارنی کے بڑے بیٹے کی شادی کے پورے دو کم پچاس سوٹ سل کر گئے تھے۔ اماں نے انچ انچ کا حساب لکھوایا تھا۔ راتوں کو



”چل اب جمع کر۔“

اس نے جمع کیا۔ دس بار کرچکا تھا اماں اپنی انگلیوں پر پھر سے کوئی ہزارویں بار جمع کر رہی تھیں۔ کالی اماں کی گود میں بچ کر چلا کر حاصل جمع بتاتا جھیل بھاگ گیا۔ ”منحوس مارے نے تیس روپے کی غلطی کی۔ دس بار کروایا، پر کبھی سوچھوڑ دیتا ہے، کبھی بچاس۔ ہزار بار کہا ہے، اتنا چلا کر مت بتایا کر میرے کان میں بتایا کر۔ نظریں لگی رہتی ہیں سب کی میرے گھر۔ کھا جائیں گی نظریں ہمیں۔ میڈ میں یہاں کا رستہ بھول جائیں گی۔ جتنا لوگ سال میں نہیں کھاتے، میرا جالا مہینے میں کھا لیتا ہے۔ پر یہ میرے کم بخت مارے بچے۔ کھلا کھلا کر میں نے ہی ان کی عقلوں پر چربی چڑھا دی۔ سڑے مسٹنڈے بھوکوں میں تو عقل پکڑے کہ دونوں الے بھی کھاؤ چھپا کے۔ روکے کہ ہمارے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں، چھپی دنیا کی نظروں سے بچے گا کچھ۔“

تھانے دارنی سر بہت کھاتی تھی۔ اسی لیے اماں نے ذرا دفتری طرز کی فرسیت بنوالی تھی۔ ایک ایک سوٹ کے آگے رقم لکھی تھی۔ لہنگے کے ہوئے پینتالیس سو دو ساڑھیاں بارہ بارہ سو، چوبیس سو، دو ہزار چار سو، ہاں، تین شرارے، چھ عدد انارکلی، آٹھ ہاتھی کان کے سے باجائے، تنگ قمیصیں، کھڑے پاجامے، لنگی شلواریں، انگرکھے، کشمیری طرز کی پشتوازیں، کچھ میگزین کے فیشن کیڑے، دو کم پچاس۔

ابھی تھانے دارینی نے آکر اس میں کٹوتی کروانی تھی۔ چیخ کر کہنی تھی۔ تھانے دارنی ہوگی تو اپنے گھر، اماں تو پورا تھانہ کھول کر بیٹھ جانے والوں میں سے تھیں۔

میں نے کہا تھا لہنگے کا پچیس دوں گی۔ کہا تھا کہ نہیں، زمرہ جڑی پستول مار کہ انگلی اٹھا کر تھانے دارنی نے دنگ کہا۔

”میں نے بھی کہہ دیا تھا پینتالیس سے ایک روپیہ کم نہیں لوں گی۔“ اماں پستول مار کہ سے ذرا نہ دیکیں ”اچھا چلیں یہ بتائیں آپ کی لندن والی ہونے لگی

دھاگے سلائی کی شکایت کی ہو؟ ہوئی اسے خبر کہ لہنگا ڈیفنس گلبرگ سے دس پندرہ ہزار میں نہیں اندرونی شہر سے اپنے جمالے سے صرف پینتالیس سو میں سلا ہے۔ سنا ہے لندن والیاں اتنے کی تو وہ لمبی لمبی باریک جرابیں خرید کر پہنتی ہیں۔“

تھانے دارنی باریک پتلی لمبی جرابوں کے ذکر پر بہت جربز ہوئی۔ بھلے سے کانوں سے دھواں نکالتی اماں نے کرنی اپنی ہی تھی۔ گل میں سے صرف دو سو ہی کم کیے۔ ڈھالی تین گھنٹے بحث چلتی رہی۔ آخری دھمکی کام کر گئی۔

”جناب جی ابھی تو سرکار نے ایک ہی بیٹے کی ہے خیر سے دو بیٹے اور ایک بیٹی بہانے کو ہیں، ڈیفنس گلبرگ سے سلوا کر شوق پورا کر لیجئے گا۔ اتنے میں تو وہ چھ سات سوٹ سی ہی دس گئے۔“

دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو بہانے کے لیے تھانے دارنی میسے پکڑا گئی۔ انٹرنیٹ سے تصویر ڈاؤن لوڈ کر کے اس کی بیٹی جمالے کو دکھا کر سمجھا گئی تھی۔ صرف اسی ٹیل ساڑھی کے گلبرگ والے نو ہزار مانگ رہے تھے۔ تو پھر جمال زندہ باد، اماں نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ گئے، بار بار گئے۔ ہاں اتنے ہی تھے جتنا راتوں کو اٹھ اٹھ کر حساب لگایا تھا۔ وہی حاصل جمع تھا۔ وہی تھا سب کا سب۔ رشک کر دیا اور رابعہ کا جینز لینے شاہ عالمی انجینس اماں۔ قسم قسم کے برتن لیے۔ یہ بڑی بڑی میڈموں ٹائپ کی دکانوں میں گئیں۔ سات ہزار کا تو صرف اماں نے وہ چمچ سیٹ لیا جس کے کنارے سنہری تھے اور جن میں میرے دم تک آئینے سی شفاف صورت نظر آنے والی تھی۔ یہ سیٹ دنیا سے ناپید ہی نہ ہو جائے۔ اماں نے جھٹ سے لے لیا۔ ہاں آتے ہوئے ریڑھی سے وہ پندیرہ روپے کی ریوڑی لیتا نہیں بھولیں۔ جمالے کو پسند تھی نا ریوڑی۔ کھاتا جاتا سلائی کرتا جاتا۔ ختم ہو جاتیں تو بھی سلائی کرتا جاتا، بھوکا ہوتا تو بھی۔ بیمار ہوتا تو بھی۔ خوش ہوتا (جو ہونے کا موقع ملا نہ دیا گیا۔) دکھی ہوتا، افسردہ، بے چین، جی کرتا نہ کرتا وہ

سلائی کیے جاتا، کیے ہی جاتا۔ جیسے دنیا بھر میں ایک وہی ہے جو سب کو کپڑے سی سی کر پہنا رہا ہے۔ صرف وہی ایک درزی ہے جہاں بھر میں۔ اس منصب پر صرف اسے ہی فائز کر دیا گیا ہے۔

پیارا جمال۔ زہیب (سونے کا) جمال۔ روز کئی کئی اندھے دیتا۔ تھک جاتا تھا اور تھکتا نہیں تھا۔ اوب جاتا تھا۔ پھر بھی لگا رہتا تھا۔

دائیں ٹانگ میں پیدا نشی لنگ تھا۔ چھ سال کا تھا۔ دایاں ہاتھ جل گیا۔ اماں نے گھر میں ہی پٹی کر دی۔ دس پندرہ دن بعد کھولی، ہاتھ مٹھی صورت بند ہو گیا۔ زخم الگ گل سڑ گئے۔ پانچ روپے کی پرچی پر اماں دوا لیتی رہیں۔ مہینوں بعد زخم ٹھیک ہو گیا۔ ہاتھ ویسا ہی مٹھی صورت رہا۔ چاروں انگلیاں زور لگانے سے ذرا سی کھل جاتیں۔ سب نے کہا مزدوری سے تو گیا۔ کسی دکان یا ہوٹل میں رکھوا دو۔“

اماں نے درزی کی دکان پر بٹھادیا۔ تین سال ایک استاد کے پاس رہا، سلائی کٹائی سیکھ لی۔ اب قینچی اس کے مٹھی بند ہاتھ میں ایسے اڑتی کہ استاد اس کی کٹائی پر فدا ہو، ہو جاتا۔ آستین کی وہ گولائی آتی کہ گاہک عیش عیش کرنے لگے۔

استاد مر گیا، اس کے بیٹوں نے دکان بیچ دی۔ جمالا خود ہی جا کر انارکلی کی ایک بڑی دکان میں کٹائی کا ٹیسٹ دے آیا۔ بڑے ماسٹر جی حیران رہ گئے۔ اتنا سا چھو کرا اور ایسی استادوں سی کٹائی۔ انارکلی کی اس دکان سے اسٹیج کے سارے بڑے بڑے اداکاروں کے کپڑے سل کر جاتے تھے۔ این سی اے پنجاب یونیورسٹی، کنیزڈ کالج اور ادھر ادھر کے دوسرے اداروں کے تھیں پیکل پروگراموں کے لیے انہی کے پاس آیا جاتا۔ لڑکے، لڑکیاں تصویریں، میگزین آئی فونز، لپ ٹاپ لیے جمالے کے پاس آ جاتے۔ گھنٹوں سر کھاتے پھر منہ مانگے پیسے دے کر جاتے۔

”ہاں، ہاں یہی۔ ایسا ہی۔ بائے گاڈ یہ تو اس سے بھی پیارا ہے۔“

مئی ڈیڈی ٹائپ لڑکیاں چلانے لگتیں۔ برگر بچے حیران رہ جاتے۔ ”یہ تو روس ہڈ کے گاؤں سے بھی زیادہ کلاسک ہے۔ تمہیں تو ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے۔“ بے چارے کچھ زیادہ ہی کہہ جاتے بل پے کرتے ایک نظر نہ دیکھتے کہ کتنے ہزار کا بنا ہے۔ ایسے لڑکے، لڑکیوں کا گروپ آتا تو ماسٹر جی کاؤنٹر کے پیچھے سے ہاتھ کے اشارے سے کہتے۔ ”وہاں اس طرف جاؤ۔“

وہ کاؤنٹر کی طرف ہی آئے چلے جاتے۔ ”ہمیں ایسے کا میٹومز سلوانے ہیں۔“ تصویریں اسکیہ چھڑ آگے رکھتے۔

”ہاں، ہاں سب سل جائے گا۔ وہاں اس کیبن میں چلے جاؤ،“ شیشے کے دروازے کے پار جمالا آؤٹینک مشین پر کام کر رہا ہوتا۔ سامنے ایک لکڑی کا بیچ رکھا ہوتا۔ وہاں آتے بیٹھتے اور چلے جاتے۔ اگلی بار آکر لے جاتے، ہاؤواؤ کرتے نہ تھکتے۔

انارکلی کی اس دکان میں جمال کے علاوہ پانچ اور درزی تھے۔ تین کٹنگ ماسٹر، دو لڑکے، بٹن کالج، اور لاک، اسٹری اور پیکنگ کے لیے، لیکن سب سے مزنگا، پیچیدہ ڈیزائن اسے ہی سلائی کے لیے دیا جاتا۔ وہ ہر نئے ڈیزائن کو جلدی سمجھ جاتا، صفائی سے سی دیتا۔ تھوڑی بہت کمی بیشی ایک، دو بار سلائی سے جاتی رہتی۔ وہ رات دن یہی کام کرتا تھا۔ وہ رات دن اس میں پہلے سے زیادہ ماسٹر ہو رہا تھا۔

اس کے ہاتھ سے نکلا کپڑا ایک انچ کم زیادہ نہ سلتا۔ اس کے ہاتھ کا کٹا کپڑا نو آموز بھی سی لیتا تو اترتا پھرتا۔





اسے معلوم ہی نہیں ہوا نہ اس نے معلوم کیا کہ وہ کیسے اس کام میں عروج کی طرف سفر کرنے لگا۔ ماسٹر جی اس سے بہت لگاؤ رکھتے۔ کہتے درویش ہے جمال، چھپا درویش، کبھی کبھار خود انار کا جوس منگو کر پیتے تو اسے بھی پلا دیتے۔ عیدین پر جہاں دو سروس کو ایک ایک سوٹ اور دو دو ہزار عیدی ملتی اسے دو سوٹ اور تین ہزار عیدی ملتی، مٹھائی کا دو کلو کا ڈبہ الگ سے۔

وہ سرجھکائے اپنا کام کرتا رہتا، کم ہی نقص نکلتے اس کے کام میں۔ ساتھ کے درزی کچھ الٹا سیدھا کر دیتے تو وہ بھی وقت نکال کر ٹھیک کر دیتا۔ وہ جمال چونو پوش درویش تھا۔

نہ اس کا چونو دکھائی دیتا نہ اس کی درویشی۔ خواتین بنا جھجکے اسے ناپ دے جاتیں جیسے کسی مرد کی لڑکے کو نہ دے رہی ہوں۔ خراب چھپائے اس برگزیدہ بزرگ کو دے رہی ہوں جو صرف بنی نوع انسان سے محبت کرتا ہے جو سب سے محبت کرتا ہے اور نفرت کو گناہ کبیرہ سمجھتا ہے اور ایسا بھی جو صرف مان لینے کے لیے پیدا ہوا ہو۔ نا سے وہ منکر ہو جانے والا ہو۔

اس کا فن اس وقت عروج پر پہنچا جب ایک خاتون نے آکر کہا کہ وہ ناپ نہیں دے سکی گی پرانے کپڑے بیماری کی وجہ سے کھلے۔ ہو گئے ہیں۔ اب اسے اپنے سائز کے کپڑے چاہئیں اور ناپ۔

جمال نے ایک نظر خاتون کو دیکھا اور سر ہلادیا۔ "سل جائے گا آپ کے ناپ کا اور سوٹ واقعی خاتون کے ناپ کا تھا۔ خاتون حیران ہوئیں، لیکن ماسٹر جی نہیں۔ "شمالاں بچے، تجھ پر خاص خدا کی رحمت ہے۔"

کچھ ایسی آتیں جو بلا وجہ اپنی کیمسٹری چلاتیں۔

وہ سٹ انیس کر دو۔ وہ نظر اٹھا کر خاتون یا لڑکی کو دیکھتا۔ "بیس کر دیتا ہوں باجی۔"

"نہیں انیس ٹھیک ہے، مجھے انیس ہی چاہیے۔" اگلی بار وہی انیس والی قمیض لیے آئیں۔ "تم لوگوں کے کاموں میں نہیں بولنا چاہیے۔ اسے بیس

ہی کر دو۔ اس کی تو شیمپ ہی ٹھیک نہیں لگتی، تم بیس ہی کر دو۔"

تو جو اسے ناپ دے جاتا، اس کے ہاتھ کا سلا لے جاتا، اسے واپس کم ہی آتا بڑا تاکہ یہاں سے ٹھیک نہیں، وہاں سے تنگ ہے۔ گلا گھرا ہو گیا۔ کالر بڑا لگ گیا۔ دامن اتنا کھلا، زپ اتنی نمایاں کیوں یہ سب اس کے ساتھ نہ ہوتا۔

خواتین اس کے ہاتھ کی فننگ کی نہیں شیمپ کی دیوانی مٹیں۔ وہ لباس نہیں آرائش سلائی کرتا تھا۔ مصور کے ہاتھ کی طرح بنانا نہیں تخلیق کرتا تھا۔ پروفیسروں، ڈاکٹروں، آرمی آفیسروں کی بیگمات کے کپڑے صرف جمال کے کو دیے جاتے۔ جمال سے پوچھ کر انہیں وقت دیا جاتا۔

"ہاں بھی جمال! میڈم اور بیس چار سوٹ لائی ہیں، سادی شلوار قمیص ہیں، کیا وقت دوں واپسی کا۔"

"ہفتے بعد کا ماسٹر جی۔"

"دو تو تیرے پاس میڈم نرگس کے لہنگے ہی ہیں۔ تین ٹیل گاؤں۔ تو ہفتے بعد کا کہہ رہا ہے۔"

"ہو جائے گا ماسٹر جی۔"

ماسٹر جی دس دن بعد کا کہہ دیتے، لیکن جمال کے کے مطابق کپڑے پہلے ہی تیار ہوتے۔ وہ اتنی کامل توجہ سے کام کرتا جیسے وقت کامل توجہ سے گزرتا ہے نہ ایک گھڑی پہلے نہ ایک گھڑی بعد، کپڑے اس کے ہاتھ ایسے آتے جیسے اس کے ہاتھوں امر ہونے آئے ہوں وہ انہیں ایسے برتنا جیسے استاد کامل شاگرد کامل کو برتنا ہے۔ اس کے دل میں کھوٹ نہ تھی۔ اس کے کام میں کھوٹ نظر نہ آتا۔

اس کے اندر کوئی کم زیادہ کا ترازو نہ تھا۔ اس کے کام میں بھی یہ ترازو نہ جڑا۔ اس کے اندر ہاں ہی ہاں تھی۔ اس کے کام میں نا کیسے نظر آتی؟

پیارے جمال کا کام سب کا دلار ابن گیا۔ اور پیارا جمال۔ خدا جانے۔



دکان میں آگ لگ گئی۔ ہفتہ پندرہ دن دکان بند رکھنی پڑی۔ ان ہفتہ پندرہ دنوں میں جمال، جمال ہو گئی۔ اماں تو دنگ رہ گئیں۔ کاروں، ٹیکسیوں میں پوچھتے پوچھتے لڑکے، لڑکیوں کے گروپ ان کے گھر آنے لگے۔ تھیریکل سیزن شروع تھا نا۔ بڑی مارا ماری تھی۔ ایک دو گروپ اسے ساتھ لے گئے۔ ہفتے بعد دس ہزار دے کر بھیجا۔ ہفتے کا دس ہزار، اماں کا منہ کھل گیا۔ دس ہزار اماں نے پورے گن لیے تھے۔ وہ کپڑے نہیں گئے تھے جو جمال سی کر آیا تھا۔ سات دنوں کی آٹھ راتوں میں وہ صرف تیرہ چودہ گھنٹے سو کر آیا تھا۔

خیو۔ خیو۔ کچھ بیگمات بھی آئیں پیچھے۔ اماں جمال کو کریدنے لگیں۔ "ایک سوٹ کا تیرا استاد کتنے میسے لیتا ہے؟" "مجھے نہیں پتا اماں!" اسے واقعی نہیں پتا تھا۔ اس نے پتا کرنا چاہا ہی نہیں تھا کبھی۔

"تو آٹھ سال سے اس کی دکان پر کام کر رہا ہے اور تجھے خبر ہی نہیں ہے۔" سیدھی سادی ہفتے میں ایک دن آدھ سیر گائے گا گوشت بکا کر صبر شکر کرنے والی اماں گوگل ڈاٹ کام بن گئیں۔ گھر سے لکلیں ناک پر سے مکھی اڑائی اور پتا کیا کہ یہ کم بخت ماری بڑی بڑی ٹیلرنگ کی دکانیں کتنے میسے لیتی ہیں میڈموں سے۔

ماسٹر سترہ ہزار دیتا تھا جمال کو۔ وہ بھی باقی سب سے چھپا کر۔ اماں اسی میں پھولی نہ ساتیں کہ ایسے ہاتھ پیر کے ساتھ بھی ان کا شہزادہ محلے کے ہر شیر جوان لڑکے سے زیادہ کما کر لاتا ہے۔ اٹھارہ افراد کے اس کے کنبے میں سترہ ہزار بہت تھا۔ بہت تھا جب تک صبر تھا، شکر تھا، بہت تھا۔

ماسٹر جی کئی بار آئے، منت کی بیس سے پچیس دینے پر آگئے، پر اماں نہ مانیں۔

"لاکھ بھی دو تو اب یہ نہیں آئے گا۔ بس اپنا ہی کرے گا اب یہ۔"

ماسٹر بڑا آبدیدہ ہوا۔ اسے لگا دکان تو اب جل رہی

ہے اب تو کوئی پانی اس آگ کو نہیں بجھا سکے گا۔ "کام کی بات نہیں، مجھے جمال سے بڑا لگاؤ ہے۔ بن جی۔"

"ہاں تو روز آکر مل لیا کرنا۔" اماں ترخ کر بولیں۔ ماسٹر جی چلے گئے۔ جمال کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔

"خبردار جو تو اسے آگے پیچھے کہیں ملا ہو تو۔۔۔ لٹیرا۔۔۔ کوٹار ہا تجھے۔"

جمال نے سر جھکا لیا۔ مان لینے والا سر کیسے اٹھاتا۔ ساری خواتین کو کہہ دیا گیا کہ گرمی، سردی سارے کپڑے جمال سے سلواؤ۔ گرمی، سردی سارے کپڑے جمال سے سلواؤ۔ جانے لگے۔ ڈرائیور کے ہاتھ کپڑے بھیج دیے جاتے۔ فون پر تفصیلات بتا دی جاتیں۔ بل اماں ڈرائیوروں کو پکڑا دیتیں۔ کام چل سو چل ایسے چلا جیسے عربی گھوڑا میدان میں سرخرو ہونے کے لیے سرپٹ دوڑا ہو۔ یہ جاوہ جا۔

دو مرلے کے میدے کے گھر میں آپا کے شوہر اور چار بچوں سمیت سولہ افراد براجمان تھے۔ اوپر کا گھر کسی اور کا تھا۔

یا اوپر والا خرید لو، یا نیچے والا بیچ دو کے مصداق اماں نے ہی اوپر والا خرید لیا۔ ایک کمرہ برآمدہ اور سات فٹ کی چھت ان کے نصیب میں لکھی گئی۔ سلائی مشین کے قلم سے۔ کمرہ برآمدہ آپا کو دے دیا گیا اور تیسری منزل پر اماں نے کمرہ کچن ماربل لگوا کر بنا لیا۔ اوپر تلے کی تین منزلیں اماں کی ہوئیں۔ اماں گردن اکڑا کر اندرون شرگھومتیں۔ آدھ سیر گائے کے گوشت کی جگہ ڈھائی سیر بکرے کے گوشت نے لے لی۔ کہاں تو سوچا کرتی تھیں کہ جیسے تیسے پیٹیاں بیاہ دیں۔ اب سونے کی قیمتوں پر نظر رکھا کرتی تھیں۔

جمال کے پیدا آئی لنگ پر پہلے تو کڑھا کرتی تھیں کہ کیا چار بہنوں کے بعد بھی آیا تو ایسا ٹیڑھا میڑھا۔ کوئی گھبرو جوان ہوتا ماں، بہنوں کا سہارا بنتا۔ اب وہ لنگ تو اماں کبھی کا بھول بیٹھی تھیں۔ خیو۔ خیو۔ آپا تو جیسے اماں نے قرض مانگ مانگ بیاہی تھی۔



دہی جاتی تھیں میدے کی تک چڑھی موسی کا جرمولی کی ریڑھی سے تو کھر کا ایک بل ہی بمشکل نکلتا۔ بیٹیاں کمال عزت سے نکل سکتی تھیں۔ تو کیا یاد ہو گئی اور کیا اپنا پیادہ لے کر اماں کے پاس ہی آئی۔ اس کے چار بچوں کا باپ کمانا نہ تھا۔ چیتھہ، دیو راب اور کھلا نہیں سکتے تھے۔ جہل ضرور کھلا سکتا تھا۔ اماں اور کمال نکل باہر کرتی۔ مصدق تو کمانے گا نہیں، لیکن لڑکی کو کمانے گا تو سی نا اور مصدق اتنا پیار کرتا تھا آیا اور بچوں سے کہ بھوکا رہے گا۔ کما کر تیں کھلائے گا۔ اماں، آیا کے پیار میں بندھی تھی۔ کیا مصدق کے اور مصدق ”کچھ نہ کرے“

کسی نے کمانے سے غریب بہت ظالم ہوتا ہے۔ جس نے بھی کمانے سے کمال کیا ہے خیر تو جہلا تھا نہ کسی کو معلوم ہی نہیں، ہوا کہ وہ کب اتنا لائق فائق ہو گیا۔ سلائی کٹائی میں کب کب چھپے چھوڑا۔ بلکہ بہت سوں کو اپنے پیچھے لگایا۔ خیر۔ خیر۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ وہ کتنا لائق، کتنا قابل ہے۔ قدر اس کے فن کی نہیں تھی قدر تو اس روپے کی تھی جو اس کے بدل میں آنا اور فرق شریف عرف میدے کے خاندان کو بڑا بہت بڑا میدے کے بوی، بچوں کو۔ خود میدے کو۔ ریڑھی چٹائی، چٹائی نہیں تو نہ سہی۔ دکانوں کے ٹھروں پر بیٹھ کر سرگرت بننے میں آخر کیا جاتا ہے۔ یہ جوان لوہڈے بھی تو بے فکر بنے پھرتے ہیں۔ گیارہ بچوں کا باپ کیوں نہیں بے فکر پھر سکتا۔ ٹھروں پر بیٹھ سکتا۔ سینا تحیف جاسکتا۔ چوک چوہاروں میں بلاوجہ ٹہل سکتا۔ کیوں نہیں بچی؟

دیے میدا اجمالے کا گایا ہے۔ میدے کی بیوی جملے کی سٹی ماں ہے اور بانی کے دس بٹے بہن بھائی، بھانجے بھانجیاں اور ہاں ایک عدو سا بھتیجی بھی۔ وہ سب کا گناہ۔ سب اس کے گتے تھے۔ تو اوپر والا کھر اماں نے پورے تیرہ لاکھ میں خریدا۔ یہ تیرہ لاکھ جملے نے کئی بیگمات کے بیٹے، بیٹیوں کی شادیوں کے کپڑے ہی کر اٹھے کیے۔

اماں نے اکتھے کیے۔ سدھی سادھی اماں، میدھی ہو گئیں۔ غربت کی تو ایسی کی تھی۔ بہت نچوڑا اس منحوس باری غربت نے تو اب اماں اس غربت کے سر ہو گئی تھیں۔ ایک ایک بال نونچ بیٹھنا چاہتی تھیں، ہاں نہ۔

وہ تو سال کی عمر سے پہلی دکان پر بیٹھا۔ اٹھارہ ماہ ہوتا، چھبیس سال کا ہو گیا۔

مخلہ سیداں کی ٹپلی گلی کے گھپ اندھیرے گھر میں وہ کپڑے سلائی کرتا رہا۔ اگر تار یا سردی آتی گھر کی مہار گزری خزاں چھائی اسے کیا خبر وہ کیوں رکے خبر اس کی گھپ اندھیری پچھلیں تو ایک ہی موسم تھا۔ ”سلائی کی ایک سی شرفاء سلائی تھیں کی آواز کا۔ وہاں ایک ہی وقت آکر ٹھہر گیا تھا۔ سر جھکا کے کام کرتے رہے۔

جہاں منہ اندھیرے اٹھتے رات گئے سو نہ۔ جب ٹپلی گلی کی باہری سوک کا حلقہ اور آنا بان بائی دکانیں بند کر رہے ہوتے وہ اپنے صوف کھینے کی تیار کر رہا ہوتا۔ جب گھر والے مونگ چلی چیل چیل کر کھا رہے ہوتے اور ٹافوں میں ٹھکے زمانے بھر کے چٹکے چھوڑ رہے ہوتے اور آخر کار تھک ہار کر سو جاتے۔ وہ تب بھی کسی میڈم کے صوفوں کی تریانی کر رہا ہوتا۔ کاری کی آخری سلائی بٹھا رہا ہوتا۔ کسی پائینڈیہ سلائی کو اوپر رہا ہوتا اور نہیں تو اگلے دن کی سلائی کے کپڑے کاٹ رہا ہوتا۔ سوئے سے پہلے اماں یا دے یار کروا کر جاتیں۔

”کل میڈم اینڈا کاڈر آئیو آئے گا۔ کپڑے تیار ہیں ان کے سہی۔“

”ہاں اماں۔“  
”کبھی بھی وہ کہہ دیتا۔“ ایک رہ گیا۔  
”کسے رہ گیا ایک، کیا کرتا رہا ہے تو۔“ سلیہ کیوں نہیں ابھی تک سارے۔ کہا بھی تھا انہوں نے فلاٹ ہے ان کی اگلے ہیٹے امریکہ کی۔ جتھے مروانے کا گایا تو ایڈو اس پیسے دے گئی ہیں وہ لو کو روایات کہہ رہا ہے۔ سلیہ نہیں۔“

وہ شرمندہ ہو جاتا۔ سوچتا کیا کرتا ہے کہ کپڑے سلیے ہی نہیں۔ آخر کیا کرتا رہا ہے سوچتا جاتا پڑے بیٹا جاتا۔

اس کا زنی بڑے بچھیا میں ہی ایک طرف لگا تھا۔ عرصہ ہوا اسے ایمر چھی سوئے اور اٹھنے کی عادت تھی۔ ہر وقت کل فلاں سوٹ دیتا ہے کی کلوار لٹتی رہتی۔ وہ بھی فارغ نہ ہوا۔ اسے بھی فارغ نہ چھوڑا گیا۔

اماں اور نہیں کپڑے استری کر دیتیں۔ جن لگا دیتیں۔ تریانی کرنے کی کوششیں کرتیں۔ ایک آدھ سوٹ کر کے ان کا ہاتھ میڑھا میڑھا، موٹا چوڑا چلنے لگتا۔ جمال کو پسند نہ آتی، پھر ان کے ہاتھ کی تریانی وہ خود ہی کرتا جاتا۔ دس بار اٹھیں سکھاتا چلا، لیکن ان کے ہاتھوں نے لڑکی ہی ضد پکڑ رکھی تھی۔

ہاں تو وہ اس کی گھاس ایک طرف چٹائی پر سو جاتا۔ منہ اندھیرے اٹھتا۔ ہاتھ دھو کر بیٹھ جاتا۔ جب تک اوپر والا نہیں خریدا تھا۔ سب پچھلے دوسرے کمرے میں ہی چٹائی پر سوئے تھے۔ اب وہاں ایک صوف سٹ لاکر رکھا تھا۔ پڑوسی سے اندر آؤ پیلے اس کی پچھا آتی تھی۔ سامنے زار بڑا کھر اور ساتھ اوپر کو جانی میڑھیال اوپر ہی باورچی خانہ کر لیا تھا اماں نے۔

اماں اٹھ کر پیلے اسے ناشتارے جاتیں۔ ایک پر اٹھا، ایک پیانی جاتے۔ کبھی کبھار اینڈے اور آماری۔ وہ جلدی جلدی ناشتارہ کرتا۔ ہر روز ہی لگتا۔ بس آج ہی ذرا جلدی ہے۔ یہ ذرا جلدی کی روز چھپے غی سالوں سے آ رہی تھی۔

ماشری کے یہاں انار کلی چلا جاتا تھا کچھ آرام تھا۔ نو بجے دکان کھلتی۔ وہ آرام سے اٹھ کر نماز دھو کر بیٹھ بھر ناشتارہ کر کے دکان پر چلا جاتا۔ جب سے گھر میں کام کرنے لگا تھا۔ بس جلدی جلدی کا اودھم مچا کر کھا تھی۔ اماں ناشتارے کروٹ دیتی آجائیں۔  
”دو کھونٹ چائے ہے،“ ختم کر لے جلدی جمالے۔  
”دو بجے مٹرم بلیٹس کاڈر آئیو آئے گا۔“  
وہ دو کھونٹ چائے چھوڑی دیتا۔ کبھی کبھار اماں

پیانی اٹھا کر وہ دو گھونٹ چائے خود اندر کر لیتیں۔ اماں نے اس جلدی جلدی کے پکڑ میں اس کا پر اٹھا ہی چھوٹا پتلا سا بیٹا شروع کر دیا تھا۔ موٹا پر اٹھا کھانے میں کتنا وقت لگ جاتا ہے۔ پیلے سے پڑے کو وہ پچھلا دیتیں جلدی کھائے گا، جلدی چپائے گا تو ہی۔

خیر۔  
تو ان کھر کے نو سالوں کے کام میں وہ دن کے دو بار واش روم میں جانے کے نکال کر۔ مٹھیں سے نکلیں ہار اٹھ کر گیا کا حساب آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ سردیوں میں ہندروٹوں میں ایک بار نمائے کو۔ اماں کہتیں۔ ”اچھی ٹھنڈے ہے، کیا کرے گا نماں۔“ کیسا جاڑا لگا ہے پڈیوں میں گھس کر کھوکھلا کر دیتی ہے ایسی ٹھنڈ۔

اور یہ ٹھنڈ اپریل تک رہتی ہے مگر میوں میں کچھ ایسا عالم رہتا ہے کہ نماں کچھ کے نیچے چھوٹو، جسم نہ جاتا ہے۔ پسند نہ تو اچھا ہوتا ہے، جسم تڑوتا رہتا ہے۔ وہ سر جھکائے کام کرتا رہتا نمائے نہ جاتا۔ وقت نے اس کی یہ ضرورت ہی ماری کہ نماں بھی ضروری ہے۔ ہاں تو تین بار عیدین کی نمازیں پڑھنے گیا۔ وہ بھی بول کے کھلے والوں نے اماں کو شرم دلائی کہ کمانی کی اس مٹھیں کو نماز تو پڑھنے بیچ دیا کرو۔ کمانی کی مٹھیں تین نمازیں ادا کر آئی۔ اماں کا بس نہ چلا مولوی صاحب کو کھر پلا کر مٹھیں کے آگے ہی جماعت لگوا لیتیں۔ اماں کہتی تھیں جو ان کے ہاتھ ایسا ہنر ہوتا تو وہ رات کو سو تھیں بھی نہ۔ یعنی صرف ہاتھ چلانے سے ہی سونا نکل رہا ہے تو ہاتھ کون بے وقوف روکے۔

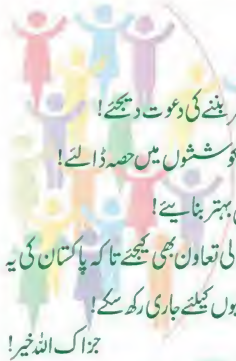
☆ ☆ ☆  
آپا سے چھوٹی راہی کی بھی شادی ہو گئی۔ محلے والے مینٹوں راہیہ کے جینز کو لے کر باتیں کرتے رہے۔ اتنا جینز سب کو جمال سا بھائی لے۔ اماں نے تین تین سو چار چار سوے کر باہر کے درزی سے کپڑے سلوا لیے راہیہ کی شادی کے، لیکن جمال کو تنگ نہ کیا۔ اس نے کہا بھی راہیہ کے کپڑے تو

## پاکستان ویب کی پیش کش



پاکستان سوشل ویب دنیا بھر میں موجود پاکستانیوں کی مقبول ترین سوشل ویب سائٹ

آئیے، آپ بھی پاکستان ویب کا ساتھ دیں:



پاکستان ویب پر درجنوں جوکر اس کے ممبر بن کر اس کا قابل فخر حصہ بنے!

اپنے دوست احباب کو پاکستان ویب کے بارے میں بتائیں اور انہیں بھی ممبر بننے کی دعوت دیجئے!

پاکستان ویب کالابریٹی شاف گروپ جو ان کے اردو ادب کے فروغ کی کوششوں میں حصہ ڈالے!

پاکستان ویب جو ان کے دنیائیں پاکستان کا نام اور اس کا اسلامی وقوفی شخص بہتر بنائیے!

پاکستان ویب کے اخراجات ادا کرنے میں انتظامیہ کے ساتھ تھوڑا بہت مالی تعاون بھی کیجئے تاکہ پاکستان کی یہ

منفرد ویب سائٹ اپنی بہترین خدمات پاکستان اور آپ جیسے محب وطن پاکستانیوں تک پہنچے جاری رکھ سکے!

جزاک اللہ خیر!

# www.Pakistan.web.pk

محبت وطن پاکستانیوں کی معیاری فنی تفریحی سوشل ویب سائٹ!

new

# www.Readers.pk

For all enthusiastic readers

BETA

کی دیتا ہوں پر اماں نے کہا۔  
”نا بھی تو صرف میڈموں کے کپڑے سی دیری نہ کر۔“

رابعہ کی شادی ہو گئی۔ اب رابعہ سے چھوٹی صاحبہ اور ہما کا جیتنیا رہو گے لگتا تھا۔ سب سے چھوٹا جمیل تھا۔ وہ اور اس سے اوپر کی چار بھین اسکول جاتی تھیں۔ اماں کہتیں ”ابھی تو پوری چھ کی بنائیں جمالے کو بنائی ہے۔ تو یوں ہوا کہ جمال لیسٹرن میں دو منٹ سے زیادہ لگا دیتا تو اماں ذرا اونچی آواز سے چلائے لگتیں۔“

”تیرا پیٹ خراب ہے۔ جمل۔ پچھلی لائی ہوں تیرے لیے ابھی۔“

جمال پچھلی کھا لیتا۔ پیٹ ٹھیک ہو جاتا۔ کٹائی کرتا جاتا۔ سلائی مشین کی مونپر پیر کا پاؤ رکھے رکھتا ہے۔ جان کپڑے اس کے ہاتھوں نکل کر جان دار ہوتے جاتے۔ رات دھل جاتی دن نکل آتا۔ دن ڈوب جاتا۔ رات چھا جاتی۔ سلائی کٹائی جاری رہتی۔ سردی آتی بارش برستی خوب برستی دھنک نکلتی، نارسے ٹھنڈا۔ لاول حلوائی کی دکان پر کالم کرنے والے لوگ آتے اور پلے بھی جاتے۔

نیل گلی کے گھروں کی چھتیں اونچی ہو گئیں۔ کسی نے ماربل لگوایا۔ کسی نے مکان بیچ دیا۔ اس کے ہم عمر لوگ بیاہ دیے گئے۔ گلی کے باہر کی سڑک بھی ہو گئی۔ اتنا کچھ ہو گیا، لیکن جمال کی کچھ میں کچھ نہ بدلا۔ وہاں وہی ریٹیم، جارح، شیغون، ٹھڈی، لال، لینن، انار علی، تنگ پاجامے، نیل گاؤں، سادھی، بلاؤز، شلوار قمیض، کٹائی، مونمر رہا۔ کس پر کون ساؤیز، ناخن سے لگا۔ یہ یاد رکھا جاتا کہ کس دن اور تاریخ کو دنا ہے۔ یہ یاد دلا یا جاتا۔ یہی موسم ہر دن، ہر سہرا۔ ہر حال میں رہا۔ اس کی بیماری میں بھی اس کا پچھتاوا نہ چھوڑا۔ وہ کھائتا کھانتا صرف کام کرتا، اسے صرف کام کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ اس پر صرف کام ہی فرض کیا گیا تھا۔

خیر۔ خیر۔  
صاحبہ کی شادی بھی دھوم دھام سے ہو گئی۔ ہما کے ساتھ اماں نے سوچا۔ جمالے کا بھی نکاح پڑھوا دیا

ساتھ اماں نے سوچا۔ جمالے کا بھی نکاح پڑھوا دیا



جہاں مہسوت رہ گیا۔ وہ مور کو کھنا بھول گیا۔ اس کے اندر ایک سوال جاگنا۔ جیلہ کا سوال! وہ کھڑے کھڑے جیلہ کا سوال بن گیا۔

اور اس کے بعد جو کپڑے ملے انہوں نے ساری میڈموں کو خوش سا کر دیا۔

کمال کر دیا اس بار تو میری بیٹی تو پھولے نہیں سا رہی تھی گاؤں پہن کر اس کی وہ فرینڈز بھی جو چھ رہی تھیں تمہارا۔ ”ایک میڈم نے باقاعدہ فون کر کے کہا۔ اس کے دل میں کوئی ٹھوٹ نہیں تھا۔ اس کے دل میں محبت کا سونا پھوٹا اور سب کچھ کر اجلا ہونے لگا۔ اس کے فون کو آٹھ چاند لگ گئے۔

”اماں! بیٹھے اوپر والا کمرہ دے دیں۔“ ہمارے نے عجیب بات کی۔ اماں کا سارا دن مہلا اور ساری رات آنکھیں۔

”کیوں ہو کیا کر کے گاؤں کے کمرے کا؟“

”بیٹھے اندر جا بہت ہوتا ہے۔ دن کی خبر نہ رات کی! دھوپ بھی نہیں آتی۔“

”دھوپ کا کیا کرے گا؟“

”دھوپ بڑی پیاری ہوتی ہے اماں۔“

”اب تو کمری آنے والی ہے۔ تیرے لیے کمرہ تو ایسا ٹھنڈا ہے کہ جیسے اسے سی لگا ہو۔ ہمیں دیکھ، کیسے گرمی میں ترپ ترپ جاتے ہیں۔ تندور بن جاتا ہے یہ تیری منزل کا کمرہ۔“

”میری تو دھوپ میرے اماں، نہیں لگی گی مجھے گرمیوں میں گرمی۔“

بار بار کی تکرار سے اماں نے اس کا سامان اٹھوا کر اوپر رکھوا دیا۔ اب وہ روز چھت پر آنے لگا تھا۔ یہ بھی نقصان تھا۔ اوپر کے کمرے میں کھڑکی سے دھوپ سدھ سی اس جگہ آتھ گھنٹہ گھنٹہ جہاں اس کی مشین رکھی تھی۔ یوں وہ مزے سے دھوپ میں کلام کرنا جاتا۔ ادھر ادھر کے دنیاوی شور و غوغے سے سزے لیتا۔

اس پاس کے سب بچوں پر ہوتا ہے۔ وہ ایک نظران سب پر بھی ڈال لیتا۔

خوش تھا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ کھلے آسمان کو دیکھتا

سے پوچھتی رہی۔

”کیسی چمک رہی ہے پھر دھوپ۔“

جھٹ پٹ اماں نے اسے نین چار کیڑوں کھلائے اور نیچے چلا گیا۔ لیکن اب ذرا سی دیر ہو چکی تھی۔ سورج کھنکی کی جڑ نکل آئی تھی۔ وہ روز پندرہ بیس منٹ ضرور دھوپ کی چمک دیکھ جاتا۔ جیلہ ہمارے اس کے قریب کہیں سرگوشیاں کرتی جاتی۔ جہاں اس کے لیے اسے جیسا تھا جس کی انگلی تمام کراغیاں انگلی کے اشارے کر کر کے اسے اس نے دنیا دکھائی تھی۔ خاندان خدا کے رنگ دکھائے تھے۔ وہ بہت خوش ہوئی اپنے استاد پر۔

”وہ سامنے سات گھر چھوڑ کر جو درہ معاف کیجئے گا جو گھر ہے اس کی چھت پر وہ اوپر کونے میں پچھا بیٹھا ایک مور ہے۔ وہ ادھر۔ ہاں لال سین کے پاس۔ ہاں وہی میرے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھیں تا جہاں بھائی۔“

جہاں آنکھیں سیکڑ کر مور ڈھونڈنا۔

”ٹھنڈی رات کے بعد دھوپ نکلے تو یہ مور ناچتا ہے۔“

”مور ناچتا بھی ہے؟“ ہمارے کو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ مور شور مچاتے بھی ہیں۔ وہ ٹھنڈی رات کا انتظار کرنا لگا۔ ایک دو بار اس نے جیلہ سے پوچھا۔

”آج رات بڑی ٹھنڈ ہے۔ اچھا تو نکل ناچے گا مور۔“

وہ ہنس دیتی۔ ”کیا بتاتا۔“

اماں اور باقی سب اتوار بازار گئیں۔ اماں تو بس دس پندرہ منٹ کا جانا آتا ہی کرتی تھیں۔ ہمارے کی فکر تھی رہتی تھی۔ باقی سب پھرتی رہتی تھیں۔ تو ان دس پندرہ منٹوں کے لیے جہاں اور وہ اوپر آگئے۔ دونوں نے چھت کی دیوار سے۔ ایک ہی دیوار سے ٹک کر ذرا دور مور کو پتا نہ تھیکھا۔

مور پنکھ دونوں کے دل میں ہوا کرنے لگے۔ مور کیوں ناچ رہا ہے۔ جیسے انہیں خبر ہو گئی۔ انسان کیوں نہ ناچے۔ انہوں نے سوچ لیا۔

کھنکی۔ ہنسون کی والی کی آنکھوں میں دھنک اتر آئی۔

کہوں یا نہیں۔ میرے پاس شہر کی بہت باتیں آٹھنی ہو گئی ہیں۔ میں رضیہ کو جا کر بتاؤں گی کہ شہر والے گڈے گڑیاں بیٹے گھروں میں رہتے ہیں، بھوتوں کے لیے بڑے بڑے گھر بنواتے ہیں اور اپنے لیے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی ہنستی ہی رہی۔

جہاں بھی ہنسنے لگا۔

”میرا تو یاد مہلا ہے آپ کے گھر میں۔ ہمارے گھر تین شام کو آپ کی سائیکل پر تک چلائی رہتی۔ رضیہ بھی اپنے بھائی کی سائیکل لے آتی ہے اور ہم ریس لگاتے۔ اتنا بڑا گھر ہے ہمارا۔ آپ تو بھی آئے ہیں نہیں نا۔ خالہ سے پوچھ لیں بے شک۔ جھوٹ نہیں ہوئی میں اور یہ آپ کا گھر ہے۔ یہاں تو سائیکل رکھنے کی جگہ بھی نہیں ہے اور یہ آپ کا کپڑوں کا گودا۔ ایسا لگتا ہے ابھی ابھی کنویں سے پانی نکلا ہے۔“

جہاں ہنسنے لگا۔ ”ابا! کلام کرنا رہا کنوئل۔“

”دھوپ چمک رہی ہے آج تو خوب۔“ وہ بار بار کہتی جاتی۔

”دھوپ بھی چمکتی ہے بھلا؟“ ہمارا کہہ بیٹھا۔

ساروں سے اس نے کہوں کی ہی چمک جو دیکھی بھائی تھی۔

”جو بھی نہیں دیکھی دھوپ چمکتی، آئیں میرے ساتھ۔ آئیں نا۔ میں دکھاؤں کیا اس ڈربے میں سارا وقت بیٹھے رہتے ہیں، کچھ خانہ خدا کی طرف بھی نظر کریں، دیکھئے کیسے کیسے رنگ بکھرے ہیں شیغون، جارح کے رنگوں کو بھول جائیں گے۔“

وہ اسے اوپر لے آئی اور وہ اس کے ساتھ اوپر اگلیا۔ اس کی ہمیشہ اماں تپا کے چار بیٹے اور اس کا گناہونٹی بھی چھت پر ادھر ادھر بیٹھے کیڑوں کے لیے کھا رہے تھے۔ دھوپ سینک رہے تھے۔ اماں نے جو اسے آتے دیکھا ناٹو سوٹ کا کرنا لگا۔ بلب جل کر بجھا۔

”ہمارے تو اوپر؟“

جہاں ایک طرف بیٹھ گیا۔ گیس کی سیلن میں جڑا اس کا جسم ٹکے لگا۔ اسے بڑا اچھا لگا۔ اماں نے قافٹ اسے کیڑوں چمیل کر دیے۔ جیلہ آنکھوں کے اشارے

سارے گھر کا کام کرنا چاہیے اسی پر فرض ہو گیا۔ اماں نے نکاح پر دھویا نہیں اور اسے اپنی سوہی سمجھ کر بیٹھ گئیں۔ کام سے فارغ ہوئی تو اماں ہمارے کے پاس بیٹھا دیکھیں۔ وہ بھی گھنٹوں تریانی کرتی جاتی، ہمیں ناگتھی رہتی۔ سڑیوں کے دن تھے۔ جہاں کی ٹھنڈی کچلا۔ میں بیٹھے بیٹھے وہ کانپ جاتی۔ ہاتھ پر سن، ہو جاتا۔ اس کا بی جاتا۔ اوپر جا کر دھوپ میں بیٹھے۔ کو۔ ایک دو بار اس نے خالہ سے کہا کہ کپڑے وہ اوپر دھوپ میں بیٹھ کر تریانی کر دیتی ہے، لیکن خالہ نے پر زور منع کر دیا۔ کپڑوں کا اس سے کچھ سے لکھنا ایسے ہی ممنوع تھا جیسے بنا چاند کے رمضان کا روزہ رکھ لینا۔

اتنے منٹے کپڑوں پر داغ دھبا لگ جائے، کون بھرے لگ۔ فرش پر صاف پلاسٹک بچھا تھا۔ ایک دیوار کی کیر لمراری اماں نے خاص ان کپڑوں کے لیے ہوائی تھی۔ وہاں احتیاط سے کپڑے نہ کیے رکھے ہوتے۔

”دس دس بار کہیں۔“

”بہت منٹے کپڑے ہیں کوئی داغ دھبا نہ لگے۔“

جیلہ نے جی کڑا کر کے آٹھ دس دن تو کلام کیا، پھر بھاگنے لگی، کام سے نہیں سیلن زدہ دم کھوٹ کھا

سے۔

”جہاں بھائی! آپ کو ڈر نہیں لگتا۔“

”کس سے؟“

”اس کمرے کی چھت نہ کر جائے۔“

”چھت کیسے کرے گی بھلا۔“

”سب گھر والے چھت پر ہیں نا۔ صرف ہم دو ہی بیچے ہیں۔“

وہ ہنسنا ہنسنا بہت اچھا ہنسنا۔ ”تم جاؤ، میں خود کر لوں گا۔“

”میں یہ کام اوپر لے جاتی ہوں، دھوپ نکلی ہے، دھوپ میں بیٹھ کر۔“

”داغ لگ جائے گا۔“

”اچھا۔“ وہ بیٹھ گئی۔

”تم جاؤ جیلہ۔“

”نہیں جہاں بھائی! آج کر لیتی ہوں، نکل سوچوں گی۔“

آنکھوں سے ہیلہ کو دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ گاؤں کی چھوٹی، بوہندہ اندھی نہیں تھیں اہل۔

\*\*\*

انگلنڈ ایک اور قصہ ہوا۔

عید میلاد النبی کا دن تھا۔ گاؤں میں بھی اچھا خاصا اہتمام ہوا، لیکن جیلہ کو نادر دین شہر کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایسی رونق کہ کبھی عید سے بھی زیادہ، سب نے سننے پڑنے پائے، رات مندی، گلوئی، چوڑیاں پہن کر آئیں۔

جلوس آتا تھا، سب چھتوں، منڈیوں پر چڑھے تھے، لڑکوں کا جلوس گھروں سے باہر تھا۔ ایک طرف جہاں حسب دستور گھر کے اندر تھا۔ سارے جلوانی خاص دودھ کی بنی کھیر کی ٹھوٹھیاں لٹکے ماتھے پر رہے رومال باندھے بانٹ رہے تھے، لڑکوں کا جم غفیر تھا جو جلوس میں کئی ہزار ٹھوٹھیاں، ٹان جلوانے، کیکو، سیب، بوس کے ڈبے، برائی کے چھوٹے ڈبے اور سبز چائے بانٹ رہے تھے۔ ٹیمبل انہیں بھی اندر سب لالاکر دے رہا تھا۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ذرا کی ذرا اجمال بھی جلوس دیکھنے باہر آیا۔ جیلہ نے سرگوشی کی۔

”آپ بھی جاؤنا چاہیے۔“

”میں۔ میرا کیا کام۔“

”سب لڑکے چل دیں۔ جلوس کا استقبال کریں۔“

”ہے۔“

وہ جیسے سے بیڑھیاں اتر کر بیٹھے۔ گیا۔ اہل گاؤں کے کھڑے چلی کی دو سری عورتوں کے ساتھ بنہ سنور کر کھڑی تھیں۔ اس پر نظر پڑتے ہی سارا جلوس ہائی ہو گیا۔

”جہاں لڑکوں؟“

”اہل یہ ذرا لال جلوانی تک۔“

”کیا کرے گا جاکہ اتنی دھکم پیل سے وہاں۔“

”مجھے آیا اہل۔“ وہ چلا گیا۔ اہل دیکھ کر لڑھک گئیں۔

سراٹھا کر آسمان کی دھند سے لپٹ جاتا اور بارش کی چھم چھم ہاتھ پر وہ بھی جھونے لگا۔ ادھر ادھر کی چھتوں سے چلتے عشق ممنوع اس نے بھی پکڑ لیے۔ وہ اعکاف جس میں وہ سالوں رہا۔ اب اس سے باہر آنے کا وقت آئے لگا۔ وہ ہیلہ کے لیے اوپر آنے کا انتظار کر رہا۔ جیلہ اس کے ہاتھ سے ملے ایک ایک کپڑے پر ہاتھ پھیرتی جاتی جاتی جاتی۔

”جاوے آپ کے ہاتھوں میں۔“

ایک عالم نے اس کی تعریف کی تھی یہ تعریف سب پر بھاری تھی۔ ایک وہ تھے جو یہ جاوے پینتے تھے۔ ایک وہ تھے جو یہ جاوے کھاتے تھے۔ لیکن وہ ان دونوں میں سے کوئی نہ تھی۔ جمال کو اپنے جاوہر کو ہونے پر خچر ہونے لگا۔

”آرام بھی کیا کریں۔ ورنہ یہ کب پکا ہو جائے گا۔“ وہ رات کو اسے کہہ کر سوئی۔

وہ اپنے کب کو کچا کرنے کے لیے رات کو جلدی سے سوئے لگا۔

”آسمان سے برف گرے گی جہاں۔“

وہ کمرے میں آئی اور جلدی سے کہہ کر چلی گئی۔ اہل کا دھڑکا لگا رہا تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور پچھ دیوڑ میں آسمان سے برف گرے لگی۔

جمال یاد با سکرانے لگا اور برف اٹھی کرنے لگا۔ نیچے سب کی ٹانوں میں دیکھتے تھے ابلے انڈے کھا رہے تھے۔ کوئلے والی کٹھن کھٹی تپ رہے تھے۔ اس کو دیا انڈا ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ سری کی بارش میں بھیج کر کھجی گرم ہی رہا۔

اہل نے دیکھا تو چیخ مار دی۔ ”نمونہ ہو جائے گا جہاں بولے۔“

لیکن اسے نمونہ نہ ہوا۔ اسے آسمان سے گرتی برف بہت اچھی لگی۔ وہ نچا پچھ بن گیا جو جنگل میں دور تک تیلی کا پتیا کر رہا ہے گھنٹوں پانی میں تیرتی پھیلیوں کو دیکھتا ہے اور تو اور جو بلی کے بلو گھڑوں کو اپنے ساتھ بستر میں لانا چاہتا ہے۔

گھنڈہ بھر وہ برف اٹھی کر رہا۔ اہل نے لال انگارہ

کر کام ہی نہیں کرتا۔ تیری بہن کی تاریخ والی ہے۔ تجھے خبری نہیں ہے۔ دو بیٹیں بیاہ دے گا تو خدا کے حضور رہے والا ہی ہو گا۔ کیا کیا نہیں کرتے بھائی بہنوں کے لیے جمیل تو چھوٹا ہے ابھی تو توڑہ دار بن۔“

وہ شرمندہ ہو گیا۔ اس رات ساری رات نہ سوایا۔ سارے کپڑے بھر سے پھیلے دیے۔ نماز پڑھ کر جیلہ کیسے اس کے کمرے میں آئی اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ ”ساری رات نہیں سوئے۔“

وہ خاموش رہا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور خاموشی سے کام کرنے لگی۔ اہل آئیں۔ دیکھ کر نبال ہو گئیں۔

”آئی صبح وہ جہاں کو لیے اس منڈیر کی طرف کھڑی تھی جہاں سے سڑک نظر آتی رہاں دودھ دلی، حلے ٹان کی کد کائیں تھیں۔ ہمدردی رش لگا رہتا۔“

”یہ سامنے والا جلوانی دودھ میں سلکھاڑوں کا آنا ملا ہے۔“

””چھا؟“ سے حیرت ہوئی۔ تمہیں کیسے پتا۔“

”میں نے کتنی بار دیکھا ہے آپ نے تو کبھی ادھر آدھر جھانکا ہی نہیں تاکہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور وہ جوتاں والے تاس کا اس کا۔“

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

”اس کا کیا ہے؟“ جمال کو اس کی ہنسی بڑی پیاری لگی۔

”وہ جو نیکی والی گھر ہے۔ نا۔ اس باجی سے پکڑ چل رہا ہے۔ باجی روز آتی ہے۔ آٹھ دس نان بنایا بیوں کے کئے جاتی ہے۔“

”ہو سلکھا ہے وہ اس کی سگی بہن ہو یا رشتہ دار ہو۔“

اب وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ ”بہت بھولے ہیں آپ بہت ہی زیادہ۔“

””اچھا۔ میں بھولا ہوں۔“ وہ بھی ہنسنے لگا۔ تو جمال نے بھی ہنسا شروع کر دیا۔ پھت کی منڈیر سے سر نیچے کر کے چند تماشے وہ بھی دیکھ کر بیٹھا۔

تو سکون سامنا۔ دھلی شام دیکھتا گہری رات دیکھتا۔ رات کے تھاں پر بچے نکلنے چراغ دیکھتا۔

اس کے اوپر آنے سے رات کو سب اب نیچے سوئے۔ دن میں اوپر آجاتے۔ لیکن اس کے کمرے میں کوئی نہ گھومتا۔ رات کو جیلہ اس کا کھانا لے آتی اور یہ جیوں پر نظر پڑ کر اسے کھلی پھت پر لے آتی اور جگمگ جگمگ تھے چراغ دکھائی دھند ہوتی تو وہ اسے کتہ کی دس تارے دھونڈ دین۔ وہ دس ہزار دھونڈ لیتا۔ اس کی آنکھوں میں۔

”ہمارے گاؤں آؤ تو آسمان ایسے صاف شفاف ہوتا ہے کہ ان ستاروں سے نظری نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے ہاتھ بڑھا کر سب مٹھی میں بند کر لیں۔ چھوٹی بھر لیں۔“

”میں تمہارے گاؤں آؤں گا۔“

”منور آنا۔“

”حیدر آبادی کرتا سی کر لاؤں گا، بہت بھلا گئے کا تم پر۔“

”منور آنا۔“

”ساتھ اندر چنہ۔ سرخ۔ ہری۔ پیلی۔“

”ہاں سرخ تو ضروری۔“

”چلو صرف سرخ ہی۔“

”اور چوڑیاں۔“

”وہ ست رنگی۔ سارے رنگ ہوں گے۔“

سارے۔ وہ اہل کے ڈر کا بہانہ کرتی نیچے بھاگ جاتی وہ بہت دیر کھڑا دھندلے آسمان میں دس ستارے دھونڈتا رہتا۔

”جہاں۔“ اہل اوپر آئیں۔

”ہاں اہل۔“

”ہاں کیا کر رہا ہے اتنی ٹھنڈی۔“ اہل کی توپ

مارک آواؤ نکلتی۔

وہ چپ کر کے کمرے میں آجاتا کوئی جواب نہ دیتا۔

اہل کپڑے گتے لگتیں۔

”چاہم ہی دے جلدی۔ باؤلا ہو گیا ہے تو تو۔“ نک



# پاکستان ویب کی پیش کش



پاکستان سوشل ویب دنیا بھر میں موجود پاکستانیوں کی مقبول ترین سوشل ویب سائٹ

آئیے، آپ بھی پاکستان ویب کا ساتھ دیں:



پاکستان ویب پر رجسٹر ہو کر، اس کے ممبر بن کر، اس کا قابل فخر حصہ بنئے!

اپنے دوست احباب کو پاکستان ویب کے بارے میں بتائیں اور انہیں بھی ممبر بننے کی دعوت دیجئے!

پاکستان ویب کالابری ری سٹاف گروپ جو ان کر کے اردو ادب کے فروغ کی کوششوں میں حصہ ڈالئے!

پاکستان ویب جو ان کر کے دنیا میں پاکستان کا نام اور اس کا اسلامی و قومی شخص بہتر بنائیے!

پاکستان ویب کے اخراجات ادا کرنے میں انتظامیہ کے ساتھ تھوڑا بہت مالی تعاون بھی کیجئے تاکہ پاکستان کی یہ

منفرد ویب سائٹ اپنی بہترین خدمات پاکستان اور آپ جیسے محب وطن پاکستانیوں تکلے باری رکھ سکے!

جزاک اللہ خیر!

## www.Pakistan.web.pk

محب وطن پاکستانیوں کی معیاری فیملی تفریحی سوشل ویب سائٹ!



## www.Readers.pk

for all enthusiastic readers BETA

”آج تو واقعی عید ہے۔ ہمیں جمالے کی شکل جو دیکھ لی۔“ بڑوں خالہ نے مسکرا کر طنز کیا! ماں کا سارا مزا کر کر اہو گیا۔

جیلہ ہاتھ ہلا کر جمال کو اوپر سے اشارے کر رہی تھی کہ فلاں ٹرائی پر کدہ بند کیا کمال! کالابری ٹرائی کیسی بھی ہے فلاں کیسے اچھل! اچھل کر ناچ رہا ہے۔ عید واقعی عید ہو گئی۔

جمال بھی ٹھوٹھیاں کے جلوس میں بانٹنے لگا۔ کسی نے اس کے گلے میں ہرے رنگ اور سنہرے کناروں والا دھنڈا ڈال دیا۔ پشانی پر رونال باندھ دیا اور پھر آخری ٹرائی میں بیٹھ کر وہ بھی جلوس کے سنک لاہور کا چکر لگانے کے لیے نکل کھڑا ہوا اور رات گئے واپس آیا اور آتے ہی سو گیا۔ اس نے بھی اتنی جگہ گھٹ نہیں دیکھی تھی۔ وہ بھی ایسے جشن کا حصہ نہیں تھا۔ آج سب ہو گیا۔

ماں اگلے ہی دن جیلہ کو اس کے گھڑوں چھوڑ آئیں۔ ”تیرا رشتہ ڈال آئی ہوں۔ تیری خالہ کدہ رہی تھی۔ سوچ کر جواب دیں گے۔“ ماں نے جمال کو آکر بتایا۔

”جیلہ ہاں کے گے تو خالہ کیسے انکار کر دیں گی۔“ جیلہ نے ناکی یا خالہ نے جیلہ کا چھوٹا بھائی مٹھانی ڈپ لے کر آگیا، گھڑی دو گھڑی بمشکل بیٹھانے بسکٹ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔

”جیلہ کا نکاح ہو گیا ہے شریف لوگ ہیں۔ عزت دیتے ہیں۔ بیٹیاں تو کسی کی بھی گھر نہیں رہتیں خالہ۔“

ماں ہونہر کہہ کر روٹیں اور پھر مسکراہٹ دیا تو جیلہ جمال کیس آئیں۔

”جیلہ کا نکاح کر دیا تو یہی خالہ نے عجیب ڈنگر بن ہے میری۔ مجھے ہاں ناکی نہیں اور لڑکی کا نکاح بڑھو دیا۔ پندرہ مرلے کا گھر ہے سرسالیوں کا، گجرات گاؤں میں، کمال وہ کمال، ہم سب اپنا بھلا ہی سوچتے ہیں۔ ہم ٹھرے غریب۔ جیلہ تو یہاں بھی کتنی پھرتی تھی ڈر ہے۔“



کر رہے تھے۔ آسمان سیاہی میں لپٹا تھا کیا بلبل آج نور  
کنکن گئے؟ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، اسے  
سکون نہ ملا۔  
سور اسڑک پر جھکی برف جمع کر رہی تھی۔ اس کے  
سر پر جمال کھڑا تھا۔

میدے کا بیٹا۔ آپا کا بھائی۔ جیل کا خالہ زاد۔  
اوس۔ اوس۔ جمال درزی۔ ماشہ۔ جادوگر۔  
جمال درزی نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر سے  
دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آسمان سے برف  
گر رہی تھی۔ کیا وہ کرنی (علیادریے کا فرشتہ) تھا۔ یہاں  
شاید نہ ہو تا تو ایسے پھوٹ پھوٹ کر نہ رو رہا ہو۔  
وہ چونے پونش درویش تھا۔ اسے چونے پونش درویش ہی  
رہنے دیا گیا۔

جمال درزی وائم الحیس (مہر کا قیدی) برف  
برساتے آسمان تلے کھڑا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف  
سے بہنوں کے لیے خصوصی ترانہ

**سای جوت لکھی**

لاختہ جین

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
فون نمبر:  
32735021  
37، ایف ہدایت، کراچی

پلاٹ لے دیا۔ وہ قسطیں جمال کو بھرتی تھیں۔ سونے کے  
کڑے، جھومر۔ نیچے نیچے اہل نے قسطوں پر حاصل  
کیے ایک دو تک کی بڑی چھوٹی چیزیں جو چنگی چار کو ٹرک  
پھر پھر جس وہ سب بھی اتنا سلمان دیا کہ سسرالیوں نے  
اٹھا اٹھا لیں یوں میں رکھا۔

خیر۔  
مٹین چلتی رہی۔ کبھی رک جاتی تو منڑو بے چاری  
یاد دلاتی۔ ”تین دن بعد یہی تاریخ ہے۔ قسطوں  
والے۔“

ہاں تو وہ اؤتالیس سال کا ہو گیا۔ خاندان میں کسی  
مرگ، غم، جوگ، خنوج، یہ نہ گیا، پہلے اہل جاتی  
تھیں، پھر ابا جانے لگے۔ اب منڑو چلی جاتی۔ نیچے  
مٹین اس پر حرام تھے۔ عید بفرقہ پر اس پر واجب نہ  
ہوتی تھیں۔ اس پر ایک ہی فرض تھا۔ اس کا ایک ہی  
فرض تھا۔ ”مٹین چلاؤ۔“

سور ابری ہونے لگی تو منڑو بی تہہ ہاتھ دھکا کر اسے  
دیکھے جاتی۔ ایک دن رونے لگی۔ ”مٹین تھک گئی تھے  
دیکھتے دیکھتے ابا۔“

ابا جمال مسکرا دیا، مسرہ کا کام کر گئے۔  
ایک دن آئی۔ ”آسمان سے برف گر رہی ہے ابا۔“  
”جیسی برف؟“ اس نے سالوں بعد وہ ٹھنڈا اٹھا رہے ہونے  
لگا۔

”قول گول مونی۔ مونی۔ چل ابا! برف اٹھی  
کر رہی۔“  
”مجھے نہیں کرنی۔“ اس کے ہاتھ کاٹنے لگے۔  
بابی، ابا کرتے کسی کا قلع سوکھا۔ سوکھا ہوا۔ بخر  
پھوٹا۔

”مٹین نے تو کبھی ایسے برف گرتی نہیں دیکھی۔  
چل ابا تو بھی دیکھ لے۔“  
جمال نے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام لیا۔ منڑو دبیز میں  
کھڑی ڈال دیاری دیکھ رہی تھی۔

نئی گلی سے باہر اہل حلوانی کی دکان کے باہر زوہاب  
لال کا بیٹا چلا آتا تھا۔ سور ا سے لے کر کھڑی ہو گئی۔  
سڑک سفید ہو چکی تھی۔ چھوٹے بڑے خوب مستی

جمال نے ٹھیک کرنے کے لیے ساڑھی نما لنگا پکڑ  
لیا۔ تین دن تیار رہا۔ کپڑے پیتا رہا۔ چھ ماہ بعد پھر تین  
دن تیار رہا۔ جیل کی رخصتی تھی۔  
”چھپتیس سال کا جمال چھپتیس سال کا ہو گیا۔ ہا“  
زارا۔ جانا یہاں نہیں۔ اس کا بھی نکاح ہو گیا۔ بیوی  
بیاہ کر اس گھاس میں آئی۔ اہل کے دور کے رشتے وار  
تھے۔ ان کی لڑکی تھی۔ لڑکی نے ایسے حالات دیکھے تھے  
کہ ماپس کی اٹھ جلی تیلی بھی محفوظ کر لینی کہ کام آئے  
گی۔ کپڑوں کی کتڑیوں سے اس نے اٹھتے پھٹتے کٹی  
رایاں بنا لیں اپنی منڈوں، منڈوں کی منڈوں کو دیں۔  
بے چاری ان لوگوں میں سے تھی جو مال میں میرا  
جو ڈالنا کسی تو خود کو فضل خرچہ سمجھنے لگی اور تو بہ  
کرئی کہ قیامت کے دن اس فضل خرچہ کا حساب  
کیسے دے گی آخر۔

جمال چھپتیس سے چھپالیس، سینتالیس، اؤتالیس کا  
ہو گیا۔ اس کی بیوی دس سال کی ہو گئی۔ سور ا جس کی  
آکھیں، جنگلی تھی تھیں۔ ہاں تو اس نے کٹی گئی  
آس پاس کے کھیتوں کا لٹا تھا کہ بتالے کی شادی نہیں  
ہونے کی شادی ہو گئی، اچھا تو کوئی اولاد نہ ہونے دے  
گی میدے کی جورو۔ اولاد بھی ہو گئی۔ خیر اب اور  
نہیں ہونے کی اولاد۔ جمال کے اور اولاد نہ ہوئی خیر۔  
اہل مر گئیں۔ ساری ہمیش بیابانی گئیں، بیل دینی چلا  
گیا۔

مٹین چلتی رہی۔ چلتی رہی۔ اوپر کے کمرے سے  
وہ اپنی گھاسیں واپس آ گیا تھا۔ موروں سے اسے نفرت  
ہو گئی تھی۔ جاڑے کی راتوں میں اس نے بھی تارے  
نہ دھونڈے۔

مٹین جو چلتی رہی، خیر۔ خیر۔  
وہ سلائی کا کام کر آتا تھا لکھا بیٹوں کے ڈھانچے  
کو کھال سارنگ دے کر مٹین کے آگے بٹھا دیا گیا  
ہو۔

ہاں تو یوں ہو ا کہ اوپر کی دو منڈیں بچ کر اہل نے آیا  
کے شوہر کو کاروبار کے لیے میسے دے دیے۔ جمال  
کے کتے بڑے بہنوئی کو۔ چھوٹی راہبہ کو قسطوں پر

جیل کے لیے ایک چھوٹا سا گھر تو لے ہی سکتا تھا۔  
اس نے اہل سے کہا۔  
”اٹھ بیوی لکھو اوس کہیں۔“  
”کھیتی نہ تو کیا کرے گا کھیتی۔ بابا میں نے ڈال  
رکھی ہے میری بہنوں کی خادوں کے لیے کھیتی۔“  
”اٹھ میرے لیے ایک ڈال دے۔ میں ایک گھر  
لوں گا۔“

صرف خدا ہی جان سکتا تھا کہ اس نے کس فرشتہ  
صفت انداز سے یہ خواہش ظاہر کی تھی ایک گھر کی۔  
جیسے ایک عبادت گاہ کی۔ اس میں نہیں دینا اٹھا کرنے  
کا لالچ نہ تھا۔ لالچ اس کے جسم کی کسی پور میں نہ تھا۔  
لالچ ہو تو وہ لاکھوں روپے کی کراں کے ہاتھ نہ پکڑتا  
جاتا۔ یہ تو صرف اس تاج محل کو بنانے کی چاہ تھی جو  
محبت کے نام پر محبت کرنے والے بنا دینا چاہتے ہیں۔

اس میں کچھ برائے تھا اس میں کچھ حرام نہ تھا۔  
”گھر۔“ اہل کی لہجے اس کا منہ دیکھتی رہیں۔  
”یہ گھر ہے نہ۔ اور کتنے گھر لے گا۔“  
”صرف ایک لوں گا۔ صرف ایک۔“ وہ جیل کا نام  
نہ لے سکا۔

اہل نے توپ مار کر قسطوں سے اسے دیکھا۔  
خیر۔ خیر۔  
اپنے فن میں راجہ ادویر (راجہ کاراجا) اپنا تاج  
عمل سہار کر دیا، بیٹا جو مور سنگ کیا تھا دونوں نے اس  
رقص عاشقان لگایا۔

باسن ہزار کی ساڑھی کی پٹیلیں بیٹھنے میں نہ  
آئیں۔ منڑو جادو نگ رہ گئیں۔ ساڑھی اٹھا کر ڈرائیور  
کے ساتھ آئیں۔

”یہ ساڑھی سی ہے کہ لنگا؟ مسز حماد کا رنگ فق  
ہو رہا تھا۔  
جمال مسز حماد کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ”مجھے  
معاف کر دیں آپا جی۔“ وہ ایک دم سے رونے لگا ہاتھ

بھی توڑ دیے مسز حماد کا کارہ گئیں۔  
”کوئی بات نہیں، ہو جاتا ہے اگر ٹھیک ہو جائے تو  
ورنہ۔“

Khawateen Digest February 2014